

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جی

جی ہیں کیا یا اپنے اے ہم
پر سنن تا رہیں ہمیں نا

لاہور

مشمولات

۱۔ حرف مراد، مدیر

۲۔ ۲

۲۔ جدید اصول تفسیر اور دبستان لوتھر، ترجمہ: نادر عقیل انصاری

۱۱۔ ۱۱

۳۔ مارٹن لوتھر کے افکار: کتاب مقدس، ترجمہ: نادر عقیل انصاری

۲۳۔ ۲۳

۴۔ تبصرہ کتب: فہم اور تشکیل، ترجمہ: نادر عقیل انصاری

۴۵۔ ۴۵

۵۔ حسن و قبح مولانا محمد ایوب دہلوی علیہ الرحمہ

۵۱۔ ۵۱

۶۔ تعلیم اور اکبر الہ آبادی، محمد دین جوہر

۷۱۔ ۷۱

۷۔ اسلام خونی، ترجمہ: محمد دین جوہر

۷۹۔ ۷۹

۸۔ غزل، ڈاکٹر کبیر اطہر

۸۴۔ ۸۴

۹۔ اسباق، محترم احمد جاوید صاحب

۸۵۔ ۸۵

۱۰۔ قنۃ انکار حدیث، نادر عقیل انصاری

۱۲۵۔ ۱۲۵



مدیر

محمد دین جوہر

نائب مدیر

نادر عقیل انصاری



مجلس ادارت

کاشف علی خان شيروانی

شاہد محمود



برائے رابطہ، استفسار اور اظہار آرا: shahidmahmood@baatdiscourse.com قیمت: ۲۰ روپے

محمد دین جوہر، مدیر ”جی“ نے تایا سنز پرنٹرز، ریٹی گن روڈ، لاہور سے چھپوا کر حسن منزل، اردو بازار، لاہور سے شائع کیا۔

فہم اور فہم: پروفیسر ہرش کی ”غایاتِ تعبیر“

پال ریکہ

ترجمہ: نادر عقیل انصاری

سنہ ۱۹۶۷ء میں ای ڈی ہرش نے اپنی کتاب ”صحتِ تعبیر“^۱ شائع کی تھی۔ اب، تقریباً دس برس بعد ان کی کتاب ”غایاتِ تعبیر“^۲ شائع ہوئی ہے۔ اُن کے بقول، اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ ”بعض اہم مباحث پر مفصل گفتگو ہو، جو پہلی کتاب میں بس اجمالاً ہی بیان ہوئے تھے۔“ تفصیل کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف اس کا انکار کرتے ہیں کہ اس کتاب میں انہوں نے اپنے ”سابقہ استدلال میں کوئی اہم نظر ثانی کی ہے۔“ میں یہ عرض کروں گا کہ اُن کی دوسری کتاب، غایاتِ تعبیر، دراصل پہلی کتاب کی تفصیل اور اس پر نظر ثانی کی بجائے اُن کے بیچ کی راہ اختیار کرتی ہے۔

پہلی کتاب نے دو مسائل پر قاری کو کچھ آشفتہ چھوڑا تھا۔ ایک نکتہ یہ تھا کہ کسی پارہٴ فن کے داخلی معنی (جنہیں پروفیسر ہرش ”لفظی معنی“ کہتے ہیں) (internal meaning or verbal meaning)، اور منشائے مصنف (جسے وہ ”مصنف کے معنی“ کہتے ہیں) (The Intention of the Author or authorial meaning) کے درمیان کیا تعلق ہے؟ انہوں نے اس موقف کا بھرپور دفاع کیا تھا کہ معنی قطعیت کے ساتھ متعین ہونے چاہئیں، ان میں خود عینیت ہونی چاہیے، تاکہ ابلاغ کے لائق ہو سکیں، اور تعبیر صحیح کا موضوع بن سکیں۔ انہوں نے اس کا بھی دفاع کیا تھا کہ تمام تعبیروں کی صحت کا آخری معیار منشائے متکلم ہے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ معنی کی خود مختاری کو مؤکد کیا جائے تاکہ قاری اسے غصب نہ کر سکے، لیکن اس کے نتیجے میں انہوں نے وہ خطرہ مول

1. Eric Donald Hirsch Jr. (born 1928), *Validity in Interpretation* (New Haven, CT: Yale University Press, 1967)

2. Eric Donald Hirsch Jr., *The Aims of Interpretation* (Chicago: University of Chicago Press: 1978)

لیا جسے ولیم ولسٹ "مغالطہ منشا" کہتا ہے^۱۔

دوسرا ابہام "صحتِ تعبیر" میں یہ تھا کہ اگر پروفیسر ہرش اصولی طور پر ایک طرف کسی تحریر کے "معنی"، اور دوسری طرف قاری اور ناقد کے لیے اس کی "اہمیت" کے درمیان امتیاز قائم رکھنا چاہتے تھے؟ تو وہ اسے پوری طرح واضح کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے، کیونکہ وہاں معنیِ متن کی تشکیل کے ممکنہ طریقوں کے بارے میں ہمارے "ظن و تخمین" کی تصدیق کا مسئلہ آڑے آ گیا تھا۔ "غایتِ تعبیر" کی اصل اور تخلیقی خوبی یہ ہے کہ اس میں معنی اور اہمیت کے امتیاز کو استدلال کی بنیاد بنایا گیا ہے، اور اس اعتبار سے یہ استدلال بالکل اچھوتا ہے۔ اس طرح مؤخر الذکر ابہام تو دور ہو گیا ہے، لیکن معنی اور اہمیت کے درمیان ایک ایسی مغایرت کی قیمت پر، جس کا دفاع نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک اول الذکر ابہام کا تعلق ہے، تو ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ علمِ تفسیر (Hermeneutics) کو "معنی" اور "اہمیت" کے امتیاز کی روشنی میں نئی جہت دینے سے، یہ ابہام کس حد تک دور ہوتا ہے۔

چنانچہ ہماری یہ تنقید "معنی" اور "اہمیت" میں مغایرت کے معاملے پر ہی مرکوز رہے گی۔ میرے رائے میں پروفیسر ہرش زیادہ محکم مقام پر ہوتے ہیں جب وہ اس فرق کو متعارف کرانے کے لیے بحث

1. "مغالطہ منشا"۔ پال ریکر کا اشارہ ولیم ولسٹ اور بیرڈزلی کے مشہور مقالے کی جانب ہے۔
Wiliam K. Wimsatt Jr. and M. C. Beardsley, "Intentional Fallacy," *The Sewanee Review*, Vol. 54, No. 3 (Jul. - Sep., 1946), 468-488

2. "Meaning" and "Significance." For the difference between these terms see E. D. Hirsch, *Validity in Interpretation* (New Haven, CT: Yale University Press, 1967)

یہ دونوں پروفیسر ہرش کی مخصوص اصطلاحات ہیں۔ چونکہ ہرش کی ان دو اصطلاحات کو سمجھنے بغیر پال ریکر کی تنقید کے صحیح رخ کا کما حقہ فہم حاصل نہیں ہو سکتا لہذا ان کی وضاحت ضروری ہے۔

ہرش کے نزدیک کسی بھی متن کے "معنی" اور "اہمیت" میں تفریق کو پیش نظر رکھنا شارح کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ "معنی" سے ہرش کی مراد لفظی و لغوی معنی ہیں، اور یہ وہ معنی ہیں جو مصنف کا منشا ہیں اور جنہیں وہ اپنے قاری تک پہنچانا چاہتا ہے۔ ہرش کے الفاظ میں معنی کا مطلب "مصنف کی وہ مراد ہے جس کے لیے اس نے علامات (الفاظ) کو ایک خاص نظم میں باندھا ہے" (صحتِ تعبیر، ۸)۔ اس کے مقابلے میں "اہمیت" وہ تعلق ہے جو "معنی" کو کسی شخص، تصور یا صورتِ حال، بلکہ کسی بھی شے سے، ہوتا ہے" (صحتِ تعبیر، ۸)۔ ہرش کے خیال میں متن کا فہم "معنی" کی تشکیل تک محدود ہے۔ تشریح اس سے آگے کا عمل ہے، یعنی معنی مفہوم کو کسی مخصوص مخاطبین کے آگے پیش کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ تشریح کے عمل میں اکثر ایسے تصورات سے مدد لی جاتی ہے جو متن کی زبان سے متعلق نہیں ہوتے۔ وہ کہتے ہیں کہ تشریح نام ہے "معنی" کو نئے الفاظ اور اصطلاحات میں بیان کرنے کا (صحتِ تعبیر، ۱۳۶)۔ چنانچہ متن کی تشریح کرنے سے پہلے اسے سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ ہرش کو احساس ہے کہ ہر عہد میں متن کی نئی تشریح کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ "تاریخی تناظر" (یعنی مخاطب کی دلچسپی کے موضوعات، اور زبان)، جن سے شارح کو سابقہ پیش آتا ہے، وقت کے ساتھ بدل جاتے ہیں (دیکھیے اس کی کتاب "صحتِ تعبیر"، ۱۳۷)۔ متن کی تنقید اور قدرشنائی میں شارح "معنی" کی "اہمیت" سے بحث کرتا ہے، یعنی وہ "معنی" کا تعلق کسی اور شے سے جوڑتا ہے۔ ہرش نے پہلے کہا کہ متن کے "معنی" اور "منشائے مصنف" ایک دوسرے کا عین ہیں (گو بعد میں انہوں نے اس موقف میں تبدیلی کر لی)۔ تاہم وہ اس کے قائل نہیں ہیں کہ متن کے معنی بالکل قطعیت کے ساتھ متعین کیے جاسکتے ہیں۔

کرتے ہیں، بمقابلہ اس مرحلے کے جب وہ اس سے پیدا ہونے والی مشکلات کو حل کرنے بیٹھتے ہیں۔ اگر ان کے موقف کا عمومی بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ دراصل یہ امتیاز محتویٰ اور سیاق میں ہے: ”معنی“ کی اصطلاح متن میں موجود لفظی معنی کے لیے ہے؛ جبکہ ”اہمیت“ متن سے آگے اس کی وہ افادیت ہے جو اس کو چاہنے کے نظام پر حکومت کرنے والے مصالح، اقدار، اور عرف سے طے ہوتی ہے۔ یہ حد بندی اقتضائے ادب سے آگے کی چیز ہے۔ عمومی اعتبار سے یہ واحد شے ہے جو مختلف زمانوں میں تجربے میں آنے والی ایک جیسی اشیاء کی عینیت کو یقینی بناتی ہے۔ ادب کے دائرے میں، ”اہمیت“ کے مقابلے میں معنی کی خود مختاری کامل طور پر اس وقت مبرہن ہوتی ہے، جب ہم یہ جان لیتے ہیں کہ لفظی فہم کا نجی عمل انہی قواعد کا پابند ہے جس کا پابند تصدیق کا اجتماعی عمل ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سمجھنا اور تصدیق کرنا دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ فہم تو ہے ہی اس کا نام کہ اپنے لیے ایک تفہیمی نقشہ، ایک وضع، ایک نمونہ تشکیل دیا جائے، جس سے وہ توقعات پیدا ہوتی ہیں جو قابل تصدیق بھی ہو سکتی ہیں اور نہیں بھی۔ لہذا، فہم کو ایک تصدیقی اور خود تصحیحی عمل تصور کر کے، پروفیسر ہرش اپنے نظریہ معنی پر، ”صحت تعبیر“ کے اپنے سابقہ نظریے کا تمام بوجھ لاد دیتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ خود کو ہر قسم کی اضافیت کے خلاف اسلحے سے لیس کر لیں، اور یوں وہ اپنی کتاب کو بالارادہ ایک مناظرانہ رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ اضافیت کے حامیوں میں ظاہر ہے کہ وہ ان نقادوں کو بھی شمار کرتے ہیں جو معنی اور اہمیت کی مغایرت کے منکر ہیں، اور ان کو بھی، جو ہائیڈیگر کے تتبع میں، فہم کے دوری ہونے پر اصرار کرتے ہیں؛ اور ان میں وہ بارتھ، فوکو، اور دریدا جیسے فرانسیسی نظریہ سازوں کو بھی شامل کر لیتے ہیں، جو ان کے الفاظ میں، ”کٹر اضافیت کے امام“ اور ”ادراکی دہریے“ ہیں۔

یہاں مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ تصورات کو اس طرح خلط ملط کرنا میرے نزدیک بہت مختلف فیہ ہے۔ ان دونوں کتابوں میں، فلسفہ تعبیر (Hermeneutic Philosophy) اور اضافیتی ادبی تنقید کے مابین، پروفیسر ہرش وہ امتیاز دیکھتے ہیں، جو قاری کے نقطہ نظر کو معنی کے معیار کے طور پر مسلط کر دے گا۔ اس پر دوسری غلطی وہ اس وقت کرتے ہیں جب اس اضافیت کے عنوان تلے نئے فرانسیسی نظریہ سازوں کو اور ہائیڈیگر کے علم تفسیر کو بھی لاکھڑا کرتے ہیں۔

اگر ایک لمحے کے لیے اس کتاب کے ادعائے کُلّیت (universalizing) کو فراموش کر دیں، تو اضافیت کے حق میں دیے جانے والے بعض دلائل پر ان کی تنقید قائل کرتی دکھائی دیتی ہے، مثلاً ان تناقضات پر ان کی بحث جو حقیقت کو نقطہ نظر پر مبنی ماننے سے پیدا ہوتے ہیں (paradoxes of perspectivism)۔ وہ اس پر بہت مضبوط استدلال کر کے ثابت کرتے ہیں کہ بصری تناظر کا استعارہ

اُس سے بالکل متضاد صورت حال کو ثابت کرتا ہے جو اضافیت اس سے اخذ کرتی ہے۔ چنانچہ میں جان سکتا ہوں کہ ایک ہی شے کو دوسرا شخص مختلف زاویے سے دیکھ رہا ہے، کیونکہ میں اپنا زاویہ نظر تبدیل کر سکتا ہوں، اور، دوسرے نقطہ ہائے نظر سے ہم آہنگ ہو کر، اُس شے کو شناخت کر سکتا ہوں جو میرے زاویہ نظر کو دوسرے کے زاویہ نگاہ سے منسلک کر رہی ہے۔ یہاں پروفیسر ہرش بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ تعبیر کے تمام عمل لازماً دو نقطہ ہائے نظر پر مشتمل ہوتے ہیں، ایک مصنف کا اور ایک شارح و مفسر کا۔ لیکن وہ یہ ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ گیڈامر (Hans-Georg Gadamer (1900-2002 کا ”اتنراج افقین“ (fusion of horizon) کا تصور بعینہ اِس جیسے دُہرے نقطہ نظر پر تدبر سے ہی پھوٹا ہے۔ یہی ژرف نگاہی ان کی کتاب کے اس باب سے عیاں ہے جس کا موضوع ”اسلوبیات اور مترادف“ ہے۔ پروفیسر ہرش پہلے تو دو انتہائی آراء کے درمیان توسط کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی اگر دو جملے مترادف ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ہر سیاق و سباق میں ایک دوسرے کی جگہ لے سکتے ہیں، کیونکہ اس صورت میں وہ حشو قبیح بن جائیں گے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اُن میں کوئی معنوی اشتراک نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں ہم یہ امر نظر انداز کر رہے ہوں گے کہ اسلوبی سطح، محتوی کے ساختیاتی تجزیے سے آزاد ہوتی ہے۔ پروفیسر ہرش اس مخلصے سے نکلنے کے لیے اس قہنیے کو، جو دونوں جملوں کا مغز ہے اور دونوں کا مترادف ہے، ان مترادف جملوں سے ممیز کر دیتے ہیں۔ یہاں بادی النظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ محتوی کے مقابلے میں وضع کا غیر متعین ہونا اضافیت کے حق میں ایک دلیل بن گیا ہے۔ لیکن پروفیسر ہرش کا جواب ہے ”نہیں!“ کیونکہ معنی کو وضع کی سرپرستی سے آزاد کرنے کے نتیجے میں، معنی اپنی شناخت کو، قہنیے کی سطح پر، بازیافت کر لیتا ہے۔ چنانچہ یہ اشتراک، بنیادی طور پر، معنی کے متعین ہونے کے حق میں ایک دلیل بن جاتا ہے۔ لیکن پروفیسر ہرش ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ کئی مترادف جملوں کی تہ میں موجود قہنیوں اور خود ان جملوں کو کسی متن کی تعبیر میں کیسے کھپایا جاسکتا ہے؟

بہر حال یہ دونوں فنی مطالعے واضح طور پر عمدہ ہیں۔ لیکن پروفیسر ہرش کا مقدمہ بالآخر اِس سوال پر قائم رہے گا، یا منہدم ہو جائے گا، کہ کیا معنی اور اہمیت کو ایک دوسرے سے مبین انداز میں الگ کیا جاسکتا ہے؟ یعنی تعبیر کے بیانی پہلو کو اس کے معیاری پہلو سے ممتاز کیا جاسکتا ہے؟ ایک اعتبار سے یہ موقف جیسے جیسے واضح ہوتا ہے، مزید اساسی ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر ہرش اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ جب انہوں نے متن کے معنی کی تشخیص ”مصنف کے اصل معنی“ سے کی تھی، تو انہوں نے معنی متن کی بہت ہی محدود اور کوتاہ تعریف کی تھی؛ یہ دوسرا ابہام ہے جس کا میں نے ابتدا میں ذکر کیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہ ابہام ان کی نئی کتاب سے کہاں تک رفع ہو سکا ہے؟ ”معنی“ اور ”اہمیت“ کی مغایرت کی منطق کا تقاضا یہ ہے کہ

منشائے متکلم ”معنی الغیر“ (meaning-for-another) کی مثال ہو، اور اس لیے یہ ”اہمیت“ کے دائرے کی چیز ہے۔ لیکن پروفیسر ہرش یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہتے۔ وہ مانتے ہیں کہ منشائے متکلم ”تعبیر“ کا واحد معیار نہیں ہے، لیکن اس پر بدستور قائم رہتے ہیں کہ یہ صحتِ تعبیر کا واحد ”عملی“ معیار ہے۔ ہر ملفوظ ”اہمیت“ کی تشکیل کرنی پڑتی ہے، لیکن کوئی تشکیل انتخاب و اختیار کے بغیر نہیں ہوتی، اور کوئی اختیار معیار کے بغیر نہیں ہوتا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ”اصل“ منشائے متکلم اپنا قطعی اظہار کرتا ہے: یعنی یہ کہ کلام کا سب سے بنیادی اخلاقی تقاضا یہ ہے کہ مصنف کے منشاکا احترام کیا جائے۔

مجھے یہ جواب سمجھ میں آرہا ہے۔ لیکن یہ جواب ایک زیادہ بنیادی مسئلے کی طرف انگشت نمائی کرتا ہے، جو سرے سے ”معنی“ اور ”اہمیت“ کے مابین ان کے قائم کردہ امتیاز کو ہی معرضِ شک میں ڈال دیتا ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ معنی کی ہر حال میں تشکیل کرنا پڑتی ہے۔ وہ مخطوطہ علامات (یعنی مکتوبہ الفاظ) میں پہلے سے موجود نہیں ہوتا۔ نیز یہ کہ صحتِ تعبیر کے نظریے میں کم از کم یہ تو فرض کیا گیا ہے کہ پہلے معنی کا اندازہ لگایا جائے گا اور پھر اس کی صحت کا۔ اس لیے ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ معنی کی خود عینیت و جدانِ ماہیت کا نتیجہ نہیں ہوتی، بلکہ صحت کے امتحان کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اب یہ بعینہ عمل تشکیل ہی ہے جس میں اختیار درپیش ہوتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی اہداف، اقدار اور عرف بھی۔ بہ الفاظ دیگر، اختیار کے مسائل تشکیلِ معنی کا لازمی حصہ ہیں۔ چنانچہ اب ہمیں تعبیر کے فقط دو پہلوؤں۔ یعنی ”اہمیت“ اور ”معنی“۔ سے نبرد آزما نہیں ہونا، بلکہ ”فنِ تعبیر کے ابعاد ثلاثہ“ (three dimensions of hermeneutics) پر بھی بات کرنی ہے (جو پروفیسر ہرش کی کتاب کے پانچویں مضمون کا عنوان بھی ہے)۔ ان ابعاد ثلاثہ میں تیسرا بُعد اخلاقی اختیار کا ہے، جو ایک جانب اجمال کی تفصیل کرنے میں دخیل ہوتا ہے، کیونکہ معنی متن کے تحقق کے لیے کسی معیار کا ہونا از حد ضروری ہے، اور دوسری جانب وہ پہلے ہی ارزیابی (evaluation) کی پیچیدگیوں میں الجھا ہوا ہے (اور یہی وجہ ہے کہ ان کا یہ مضمون کتاب کے درمیان میں واقع ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ قاری کو کتاب کے پہلے حصے سے دوسرے حصے کی طرف جانے والا راستہ عبور کرایا جائے)۔

کتاب کا دوسرا حصہ، جو ارزیابی کے لیے مختص ہے، قاری کے شبہات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ ”معنی“ اور ”اہمیت“ کے مابین خطِ امتیاز کو ابہام کے پردے میں ہی قائم رکھا جاسکتا ہے۔ پروفیسر ہرش یہ کہنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ نار تھاپ فرائے¹ اور رینی ویلیک² کے تنازعے میں۔ جو اس سوال پر برپا ہوا تھا کہ قدر اور معنی کو منفصل رکھنا ممکن ہے یا نہیں۔ نار تھاپ فرائے حق پر ہے۔ ایک طرف انفصال کے قائلین

1. Northrop Frye (1912-1991), the renowned Canadian literary theorist, author of Anatomy of Criticism.

2. Rene Wellek (1903-1995), the author of Theory of Literature.

جزوی اعتبار سے درست ہیں، کیونکہ توصیف (description) اور تقدیر دراصل تعبیر کے دو عمود ہیں۔ پروفیسر ہرش کا استدلال جس دعوے پر مضبوطی سے قائم ہے وہ قطعی انفصال کے مقابلے میں قلیل التصريح ہے۔ ادبی تنقید سے یہ مطالبہ بالکل جائز ہے کہ وہ کسی تخلیق کی قدر کے بارے میں اپنے اختلافات کو اُس معنی سے مربوط کر کے دکھائے جس پر وہ متفق ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔

یہ بھی بالکل جائز ہے کہ جب تک کسی متن کی مشترکہ توصیف کی کوشش جاری ہو، تخمینہ قدر کے بارے میں تنازعات کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ لیکن تعبیر کے ٹھوس کام میں یہ دونوں وظائف مسلسل باہم خلط ملط ہوتے رہتے ہیں، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ انفصال کے مخالف بھی جزوی اعتبار سے درست ہیں۔ یہ مشکل متوقع تھی، کیونکہ معنی کے بارے میں ہمارا علم کسی طرح سے بھی کسی وجدانی بصیرت سے تصدیق یافتہ نہیں ہے۔ چونکہ معنی کی تشکیل کرنی پڑتی ہے، لہذا قدر اور معنی لازماً ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ بلکہ جب پروفیسر ہرش ایمانوئل کانٹ کی تیسری تنقید میں ”ذوالجمال کی تجزیات“ کی طرف رجوع کرتے ہیں، تو اس سے واقعے اور قدر کے مابین لاینفک تعلق کے نظریے کو تقویت ملتی ہے، کیونکہ کانٹ کے نظریے ”عقل عام“ میں اقدار کے بارے میں لگایا جانے والا (معروضی نہیں بلکہ) داخلی حکم ہی ابلاغ کا سزاوار ہوتا ہے، اور اس معنی میں عام ہوتا ہے۔ یہ بات قابل فہم ہے کہ یہ مان لینے کے بعد پروفیسر ہرش، آخری باب میں، تاکید کرتے ہیں کہ یہ ”مداخلت“ معنی اور اہمیت کے مابین بنیادی امتیاز کو ہرگز مشتبہ نہ کرنے پائے۔ اگر اضافیت ہی وہ حریف ہے جسے مغلوب کرنا مقصود ہے، اور اگر اس اضافیت کی جدید ترین قسم وہ ہے جو فرانسیسی نظریہ سازوں کے ہاں پائی جاتی ہے، جن پر الزام ہے کہ انہوں نے تمام متون کی شرح کو ایک افسانہ بنا دیا ہے، تو یہی وہ مقدمہ ہے جس پر کتاب کا اصل مدار رہنا چاہیے۔ یہ پروفیسر ہرش کا جذبہ مبارزت ہے جو ان کو یہاں تک لے گیا ہے کہ قدر کے متزلزل اقلیم کو، معنی کے مستحکم اقلیم کے تابع کر دیں۔ لیکن کیا انہوں نے خود ہی، یہ ثابت کر کے۔ کہ تمام متون کے معنی کی تشکیل از بس لازم ہوتی ہے، اور ہر تشکیل اختیار کا تقاضا کرتی ہے، اور استعمال اختیار میں اخلاقی اقدار دخیل ہوتی ہیں۔ اس اقلیم کی بنیادوں کو متزلزل نہیں کر دیا؟

* *

Source:

Paul Ricoeur, (1913-2005) "Construing and Constructing: A review of *The Aims of Interpretation* by E. D. Hirsch, Jr.," Times Literary Supplement 197, No. 3911 (25 February, 1977): 216

* * *